مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

دینِ حق

(یہ خطبہ ۲۱ر مارچ ۱۹۴۳ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں دیا گیا تھا)

قرآن جس دعوے کے ساتھ نوعِ انسانی کو اپنے پیش کردہ مسلک کی طرف دعوت دیتا ہے، وہ خود اس کے اپنے الفاظ میں یہ ہے :

اِنَّ الدِّیۡنَ عِندَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ

یہی ذرا سا فقرہ میری اس تقریر کا موضوع ہے۔ زیادہ تفصیل کا موقع نہیں، بہت اختصار کے ساتھ میں پہلے اس کے معنیٰ کی تشریح کروں گا، جس سے واضح ہو جائے گا کہ اس فقرے میں دراصل کس چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ پھر اس سوال پر بحث کروں گا کہ یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے یا نہیں اور آخر میں یہ بیان کروں گا کہ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو پھر اس تسلیم کرنے کے مقتضیات کیا ہیں۔

عموماً اس فقرے کا جو سیدھا سادھا مفہوم بیان کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ "سچا مذہب تو اللہ کے نزدیک بس اسلام ہی ہے" اور "اسلام" کا جو تصور عام طور پر لوگوں کے ذہن میں ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ یہ ایک مذہب کا نام ہے، جو اب سے تیرہ سو برس پہلے عرب میں پیدا ہوا تھا اور جس کی بنا حضرت محمد ﷺ نے ڈالی تھی"۔ "بنا ڈالی تھی" کا لفظ میں قصداً اس لیے استعمال کر رہا ہوں کہ صرف غیر مسلم ہی نہیں، بلکہ بکثرت مسلمان اور اچھے خاصے ذی علم مسلمان، بھی حضرت محمد ﷺ کو "بانیِ اسلام" کہتے اور لکھتے ہیں۔ گویا ان کے نزدیک اسلام کی ابتدا آنحضرت ﷺ ہی سے ہوئی ہے اور آپ ہی اس کے بانی ہیں۔ لہٰذا جب ایک غیر مسلم قرآن کا

مطالعہ کرتے ہوئے اس فقرے پر پہنچتا ہے، تو وہ یہ گمان کرکے سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے کہ جس طرح ہر مذہب صرف اپنے ہی برحق ہونے اور دوسرے مذہبوں کے باطل ہونے کا مدعی ہے، اسی طرح قرآن نے بھی اپنے پیش کردہ مذہب کے برحق ہونے کا دعویٰ کر دیا ہے۔ اور جب ایک مسلمان اسے پڑھتا ہے تو وہ اس وجہ سے اس پر غور کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھتا کہ جس مذہب کو اس فقرے میں برحق کہا گیا ہے، اسے وہ خود بھی برحق مانتا ہے۔ یا اگر غور وفکر کے لیے، اس کے ذہن میں کوئی تحریک پیدا ہوتی بھی ہے تو وہ بالعموم یہ رخ اختیار کر لیتی ہے کہ عیسائیت، ہندومت، بودھ مت اور ایسے ہی دوسرے مذاہب سے اسلام کا مقابلہ کرکے اس کی حقانیت ثابت کی جائے۔ لیکن درحقیقت قرآن میں یہ مقام ایسا ہے، جس پر ایک سنجیدہ طالب علم کو ٹھہر کر بہت غور کرنا چاہیے۔ اس سے زیادہ غور کرنا چاہیے جتنا اب تک اس پر کیا گیا ہے۔

قرآن کے اس دعوے کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے ''الدین'' اور ''الاسلام'' کا مفہوم متعین کر لینا چاہیے۔

اَلدِّین کا مفہوم

عربی زبان میں لفظ ''دین'' کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس کے ایک معنیٰ غلبہ اور اقتدار کے ہیں۔ دوسرے معنیٰ اطاعت اور غلامی کے ہیں، تیسرے معنیٰ جزا اور بدلے کے اور چوتھے معنیٰ طریق اور مسلک کے۔ یہاں یہ لفظ اسی چوتھے معنیٰ میں استعمال ہوا ہے۔ دین سے مراد وہ طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے کہ جس کی پیروی کی جائے۔

لیکن یہ خیال رہے کہ قرآن محض دین نہیں بلکہ الدین کہہ رہا ہے۔ اس کے معنیٰ میں وہی فرق واقع ہو جاتا ہے، جو انگریزی زبان میں This is a way کہنے کے بجائے This is the way کہنے سے واقع ہو جاتا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک اسلام ایک طریقِ زندگی ہے، بلکہ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام ہی ایک حقیقی اور صحیح طریقِ زندگی یا طرزِ فکر و عمل ہے۔ پھر یہ بھی ذہن نشیں رہے کہ قرآن اس لفظ کو کسی محدود معنی میں استعمال نہیں کرتا بلکہ وسیع ترین معنی میں استعمال کرتا ہے۔ طریقِ زندگی سے اس کی مراد زندگی کے کسی خاص پہلو یا کسی خاص شعبے کا طریق نہیں، بلکہ پوری زندگی کا طریق ہے۔ الگ الگ، ایک ایک شخص کی انفرادی زندگی ہی کا طریق نہیں، بلکہ بحیثیت مجموعی سوسائٹی کا طریق بھی ہے۔ ایک خاص ملک یا ایک

خاص قوم یا ایک خاص زمانے کا طریق نہیں، بلکہ تمام زمانوں میں تمام انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا طریق ہے۔ لہٰذا قرآن کے دعوے کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ کے نزدیک پوجا پاٹ اور عالمِ بالا کے اعتقاد اور حیاتِ بعد الممات کے تصور کا ایک صحیح مجموعہ وہی ہے، جس کا نام اِسلام ہے۔ نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ افرادِ انسانی کے مذہبی طرزِ خیال وعمل کی (جیسا کہ لفظ ''مذہبی'' کا مفہوم آج کل کی مغربی اصطلاح میں لیا جاتا ہے) ایک صحیح صورت وہی ہے، جسے اسلام سے تعبیر کیا گیا ہے نہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ عرب کے لوگوں، یا فلاں صدی تک کے انسانوں، یا فلاں دور، مثلاً صنعتی انقلاب سے پہلے تک کے آدمیوں کے لیے، ایک صحیح نظامِ زندگی وہی ہے، جس کو اسلام سے موسوم کیا گیا ہے، بلکہ صریح طور پر اس کا دعویٰ یہ ہے کہ ''ہر زمانے اور ہر دور میں پوری نوعِ انسانی کے لیے زمین پر زندگی بسر کرنے کا ایک ہی ڈھنگ اللہ کے نزدیک صحیح ہے اور وہ ڈھنگ وہی ہے جس کا نام اَلاِسلام ہے۔''

مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ ایشیا اور یورپ کے درمیان کسی مقام پر قرآن کی کوئی تفسیر کی گئی ہے جس کی رو سے دین کا مفہوم صرف بندے اور خدا کے انفرادی تعلق تک محدود ہے، اور تمدن اور سیاست کے نظام سے اس کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔[1] یہ تفسیر اگر خود قرآن سے اخذ کی گئی ہے تو یقیناً بڑی دلچسپ چیز ہو گی، لیکن میں نے اٹھارہ سال تک قرآن کا جو تحقیقی مطالعہ کیا ہے، اس کی بنا پر میں بلا خوفِ تردید کہتا ہوں کہ قرآن اپنے تمام جدید مفسرین کی خواہشات کے علی الرغم ''اَلدّین'' کے لفظ کو کسی محدود معنیٰ میں استعمال نہیں کرتا، بلکہ اس سے تمام زمانوں کے تمام انسانوں کے لئے ان کی پوری زندگی کا نظامِ فکر وعمل مراد لیتا ہے۔

الاسلام کا مفہوم

اب لفظ ''اسلام'' کو لیجیے۔ عربی زبان میں اس کے معنیٰ ہیں سپر ڈال دینا، جھک جانا، اطاعت قبول کر لینا، اپنے آپ کو سپرد کر دینا۔ مگر قرآن محض ''اسلام'' نہیں بولتا۔ بلکہ الاسلام بولتا ہے، جو اس کی خاص اصطلاح ہے۔ اس مخصوص اصطلاحی لفظ سے اس کی مراد خدا کے آگے جھک جانا، اس کی اطاعت قبول کر لینا، اس کے مقابلے میں اپنی آزادی سے دست بردار ہو جانا اور اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینا ہے۔ اس تسلیم واطاعت اور سپردگی وحوالگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قانونِ طبیعت *Law of Nature* کے آگے سپر ڈال دی جائے۔ جیسا کہ بعض لوگوں نے

اس کا مفہوم قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ نہ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ انسان اپنے تخیل یا اپنے مشاہدات و تجربات سے خدا کی مرضی اور اس کے منشاء کا جو تصور بطور خود اخذ کر لے، اسی کی اطاعت کرنے لگے، جیسا کہ اور لوگوں نے غلطی سے سمجھ لیا ہے، بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ خدا نے خود اپنے رسولوں کے ذریعے سے انسان کے لیے جس طریق فکر و عمل کی طرف رہنمائی کی ہے، اس کو قبول کر لے اور اپنی آزادیٔ فکر و عمل یا بالفاظِ صحیح تر آوارگیٔ فکر و عمل چھوڑ کر اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر لے۔ اسی چیز کو قرآن ''الإسلام'' کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے اور یہ درحقیقت کوئی جدید العہد مذہب نہیں ہے، جس کی بنا اب سے تیرہ سو ترسٹھ برس پہلے عرب میں محمد ﷺ نے ڈالی ہو، بلکہ جس روز پہلی مرتبہ اس کرۂ زمین پر انسان کا ظہور ہوا، اسی روز خدا نے انسان کو بتایا تھا کہ تیرے لیے صرف یہ ''الإسلام'' ہی صحیح طرزِ عمل ہے اور اس کے بعد دنیا کے مختلف گوشوں میں وقتاً فوقتاً جو پیغمبر بھی خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مامور ہوئے ہیں، ان سب کی دعوت بھی بلا استثناء اسی ''الإسلام'' ہی کی طرف رہی ہے، جس کی طرف بالآخر محمد ﷺ نے دنیا کو دعوت دی۔ یہ اور بات ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے پیرووں نے بعد میں بہت سی مختلف چیزوں کی آمیزش کر کے ایک نظام یہودیت کے نام سے اور مسیح علیہ السلام کے پیرووں نے ایک دوسرا نظام مسیحیت کے نام سے اور اسی طرح ہندستان، ایران، چین اور دوسرے ممالک کے پیغمبروں کی امتوں نے مختلف مخلوط و مرکب نظامات دوسرے ناموں سے بنا لیے ہوں۔ لیکن موسیٰ اور مسیح اور دوسرے تمام معروف و غیر معروف انبیاء علیہ السلام، جس دین کی دعوت دینے آئے تھے، وہ خالص اسلام تھا، نہ کہ کچھ اور۔

قرآن کا دعویٰ کیا ہے

اس تشریح کے بعد قرآن کا دعویٰ بالکل صاف اور واضح صورت میں ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ اور وہ یہ ہے :

> ''نوعِ انسان کے لیے خدا کے نزدیک صرف یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے کہ وہ خدا کے آگے سرِتسلیم خم کر دے اور فکر و عمل کی اس راہ پر چلے جس کی طرف خدا نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے رہنمائی کی ہے''

یہ ہے قرآن کا دعویٰ۔ اب ہمیں یہ تحقیق کرنا ہے کہ آیا یہ دعویٰ قبول کیا جانا چاہیے۔ خود

قرآن نے اپنے اس دعوے کی تائید میں جو دلائل قائم کیے ہیں، ان پر ہم غور کریں گے ہی؛ مگر کیوں نہ اس سے پہلے خود اپنی جگہ تلاش و تجسس کر کے یہ دریافت کرلیں کہ ہمارے لیے اس دعوے کو قبول کرنے کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی ہے۔

طریقِ زندگی کی ضرورت

یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں انسان کو زندگی بسر کرنے کے لئے بہر حال ایک طریقِ زندگی درکار ہے جسے وہ اختیار کرے۔ انسان دریا نہیں ہے، جس کا راستہ زمین کے نشیب و فراز سے خود متعین ہو جاتا ہے، انسان درخت نہیں ہے، جس کے لیے قوانین فطرت ایک راہ طے کر دیتے ہیں۔ انسان نِرا جانور نہیں ہے، جس کی رہنمائی کے لیے تنہا جبلت ہی کافی ہو جاتی ہے۔ اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے میں قوانین طبیعت کا محکوم ہونے کے باوجود انسان زندگی کے بہت سے ایسے پہلو رکھتا ہے، جن میں اسے کوئی لگا بندھا راستہ نہیں ملتا کہ حیوانات کی طرح بے اختیار اس پر چلتا رہے بلکہ اس کو اپنے انتخاب سے خود ایک راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ اس کو فکر کی ایک راہ چاہیے، جس پر وہ اپنے اور کائنات کے ان بہت سے مسائل کو حل کرے، جنھیں فطرت اس کے سوچنے والے دماغ کے سامنے پیش کرتی ہے، مگر ان کا کوئی حل غیر مشتبہ زبان میں نہیں بتاتی۔ اس کو علم کی ایک راہ چاہیے، جس پر وہ ان معلومات کو منظم کرے، جنہیں فطرت اس کے حواس کے ذریعے سے اس کے ذہن تک پہنچاتی ہے۔ مگر انھیں بطور خود منظم کر کے اس کے حوالے نہیں کر دیتی۔ اس کو شخصی برتاؤ کے لیے ایک راہ چاہیے، جس پر وہ اپنی ذات کے بہت سے ان مطالبات کو پورا کرے، جن کے لیے فطرت تقاضا کرتی ہے، مگر انھیں پورا کرنے کا کوئی مہذب طریقہ معین کر کے نہیں دیتی۔ اس کو گھریلو زندگی کے لیے، خاندانی تعلقات کے لیے، معاشی معاملات کے لیے، ملکی انتظام کے لیے، بین الاقوامی ربط و تعلق کے لیے اور زندگی کے بہت سے دوسرے پہلوؤں کے لیے بھی، ایک راہ درکار ہے، جس پر وہ محض ایک شخص کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ ایک جماعت، ایک قوم، ایک نوع کی حیثیت سے بھی چلے اور ان مقاصد تک پہنچ سکے جو اگرچہ فطرتاً اس کے مطلوب و مقصود ہیں مگر فطرت نے نہ تو ان مقاصد کو صریح طور پر اس کے سامنے نمایاں کیا ہے اور نہ ان تک پہنچنے کا ایک راستہ معین کر دیا ہے۔

زندگی کی تقسیم

زندگی کے یہ مختلف پہلو، جن میں کوئی ایک طریق اختیار کرنا انسان کے لیے ناگزیر ہے۔ بجائے خود مستقل اور ایک دوسرے سے بے نیاز شعبے یا محکمے نہیں ہیں کہ ان میں ہر ایک کے لیے آدمی الگ الگ راہیں اختیار کرسکتا ہے، جن کی سمتیں الگ ہوں، جن کے زادِ راہ الگ ہوں، جن پر چلنے کے ڈھنگ اور انداز الگ ہوں، جن کی راہ نوردی کے مقتضیات الگ ہوں اور جن کے منازلِ مقصود الگ ہوں۔ انسان اور اس کی زندگی کے مسائل کو سمجھنے کی ایک ذرا سی دانش مندانہ کوشش ہی آدمی کو اس پر مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے کہ زندگی بحیثیت مجموعی ایک ہے۔ جس کا ہر جز دوسرے جز سے اور ہر پہلو دوسرے پہلو سے، گہرا ربط رکھتا ہے۔ ایسا ربط رکھتا ہے جو توڑا نہیں جاسکتا۔ ہر ایک دوسرے پر اثر ڈالتا ہے اور اس سے اثر قبول کرتا ہے۔ ایک ہی خون سب رگوں میں گردش کرتا ہے۔ ایک ہی روح سب میں سرایت کیے ہوئے ہوتی ہے اور سب مل کر وہ چیز بناتے ہیں، جسے انسانی زندگی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا فی الواقع جو چیز انسان کو درکار ہے، وہ زندگی کے مقاصد نہیں، بلکہ مقصد ہے، جس کے ضمن میں سارے چھوٹے بڑے مقاصد پوری موافقت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ لے سکیں اور جس کے حصول کی کوشش میں سب حاصل ہوجائیں، اس کو راستے نہیں بلکہ راستہ درکار ہے، جس پر وہ اپنی پوری زندگی کو اس کے تمام پہلوؤں سمیت، کامل ہم آہنگی کے ساتھ اپنے مقصودِ حیات کی طرف لے چلے۔ اس کو فکر، علم، ادب، آرٹ، تعلیم، مذہب، اخلاق، معاشرت، معیشت، سیاست، قانون وغیرہ کے لیے الگ الگ نظامات نہیں، بلکہ ایک جامع نظام درکار ہے، جس میں یہ سب ہمواری کے ساتھ سموئے جا سکیں، جس میں ان سب کے لیے ایک ہی مزاج اور ایک ہی طبیعت رکھنے والے مناسب اصول موجود ہوں اور جس کی پیروی کر کے آدمی اور آدمیوں کا مجموعہ اور من حیث الکل پوری آدمیت، اپنے بلند ترین مقصود تک پہنچ سکے۔ وہ جاہلیت کا تاریک دور تھا، جب زندگی کو مستقل جداگانہ شعبوں میں تقسیم کرنا ممکن خیال کیا جاتا تھا۔ اب اگر کچھ لوگ اس طرزِ خیال کی مہمل گفتگو کرنے والے موجود ہیں، تو وہ بے چارے یا تو اخلاص کے ساتھ پرانے خیالات کی فضا میں اب تک سانس لے رہے ہیں، اس لیے قابلِ رحم ہیں، یا پھر وہ ظالم حقیقت کو خوب جانتے ہیں، مگر جان بوجھ کر یہ گفتگو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ جس ”دین“ کو وہ کسی انسانی آبادی میں رائج کرنا

چاہتے ہیں۔ اس کے اصولوں سے اختلاف رکھنے والوں کو انھیں یہ اطمینان دلانے کی ضرورت ہے کہ ہمارے اس دین کے تحت تمہیں زندگی کے فلاں فلاں شعبوں میں، جو بد قسمتی سے تم کو عزیز تر ہیں، پورا تحفظ حاصل رہے گا۔ حالانکہ یہ تحفظ عقلاً محال، فطرتاً ممتنع، عملاً ناممکن ہے۔ اس طرح کی گفتگو کرنے والے غالباً خود بھی جانتے ہیں کہ یہ ناممکن ہے۔

ہر دین غالب زندگی کے تمام شعبوں کو اپنی روح اور اپنے مزاج کے مطابق ڈھال کر ہی رہتا ہے۔ جس طرح ہر کانِ نمک ان تمام چیزوں کو مبدل بہ نمک کر کے ہی رہتی ہے، جو اس کے حدود میں داخل ہو جائیں۔

زندگی کی جغرافیائی و نسلی تقسیم

پھر جس طرح یہ بات مہمل ہے کہ انسانی زندگی کو جداگانہ شعبوں میں تقسیم کر دیا جائے، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ مہمل بات یہ ہے کہ اسے جغرافیائی حلقوں یا نسلی دائروں میں تقسیم کیا جائے۔ انسان بلاشبہ زمین کے حصوں میں پایا جاتا ہے، جن کو دریاؤں نے، پہاڑوں نے، جنگلوں اور سمندروں نے یا مصنوعی سرحدوں نے تقسیم کر رکھا ہے اور انسان کی بہت سی مختلف نسلیں اور قومیں بھی ضرور پائی جاتی ہیں، جن کے درمیان تاریخی، نفسیاتی اور دوسرے اسباب سے انسانیت کے نشو و ارتقاء نے مختلف صورتیں اختیار کی ہیں، لیکن اس اختلاف کو حجت قرار دے کر جو شخص یہ کہتا ہے کہ ہر نسل، ہر قوم اور ہر جغرافیائی آبادی کے لیے "دین"، یعنی نظامِ زندگی الگ ہونا چاہیے وہ سراسر ایک مہمل بات کہتا ہے۔ اس کی محدود نگاہ مظاہر اور عوارض کے اختلاف میں الجھ کر رہ گئی، اس ظاہری کثرت کے اندر جوہر انسانیت کی وحدت کو وہ نہیں پا سکا۔ اگر فی الواقع یہ اختلاف اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان کی بنا پر دین الگ الگ ہونے چاہییں، تو میں کہوں گا کہ زیادہ سے زیادہ جو اختلافات ایک ملک اور دوسرے ملک، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان آپ پاتے ہیں ان سب کو جس قدر مبالغے کے ساتھ چاہیں قلم بند کر لیں اور پھر ان اختلافات کا خالص علمی جائزہ لیں، جو عورت اور مرد میں پائے جاتے ہیں، جو ہر انسان اور دوسرے انسان میں پائے جاتے ہیں، جو ایک ہی ماں اور باپ کے دو بچوں میں پائے جاتے ہیں، شاید میں مبالغہ نہ کروں گا اگر یہ دعویٰ کروں کہ علمی تحلیل و تجزیہ میں پہلی قسم کے اختلافات سے یہ دوسری قسم کے اختلافات بہر حال شدید تر ہی نکلیں گے۔ پھر کیوں نہ کہہ دیجیے کہ ہر فرد کا نظامِ زندگی الگ ہونا

چاہیے؟ مگر جب آپ انفرادی، جنسی، خاندانی کثرتوں کے اندر وحدت کا ایک عنصر اور پائدار عنصر ایسا پاتے ہیں جس کی بنیاد پر قوم، وطن یا نسل کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور اس تصور کی بنا پر ایک قوم، یا ایک ملک کی کثیر آبادی کے لیے ایک نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جاتا ہے، تو آخر کس چیز نے آپ کو روک دیا ہے کہ قومی، نسلی، وطنی کثرتوں کے درمیان ایک بڑی اور بنیادی وحدت کا عنصر آپ نہیں پا سکتے، جس پر انسانیت کا تصور قائم ہو اور جس کی بنا پر تمام عالمِ انسانی کا ایک دین یا نظامِ زندگی ہونا ممکن خیال کیا جائے؟ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ تمام جغرافیائی، نسلی اور قومی اختلافات کے باوجود وہ قوانینِ طبعی یکساں ہیں، جن کے تحت انسان دنیا میں زندگی بسر کر رہا ہے، وہ نظامِ جسمانی یکساں ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی ہے، وہ خصوصیات یکساں ہیں، جن کی بناء پر انسان دوسری موجودات سے الگ ایک مستقل نوع قرار پاتا ہے، وہ فطری داعیات اور مطالبات یکساں ہیں، جو انسان کے اندر ودیعت کیے گئے ہیں۔ وہ قوتیں یکساں ہیں، جن کے مجموعے کو ہم نفسِ انسانی کہتے ہیں۔ بنیادی طور پر وہ تمام طبعی، نفسیاتی، تاریخی، تمدنی، معاشی عوامل بھی یکساں ہیں، جو انسانی زندگی میں کارفرما ہیں؟ اگر یہ واقعہ ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ یہ واقعہ نہیں ہے، تو جو اصول انسان بحیثیتِ انسان کی فلاح کے لیے صحیح ہوں، ان کو عالمگیر ہونا چاہیے، ان کے قومی یا نسلی یا وطنی ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ قومیں اور نسلیں ان اصولوں کے تحت اپنی خصوصیات کا اظہار اور جزوی طور پر اپنے معاملاتِ زندگی کا بندوبست مختلف طریقوں سے کر سکتی ہیں اور ان کو ایسا کرنا چاہیے۔ مگر انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے، جس صحیح دین یا نظامِ زندگی کی ضرورت ہے، وہ بہر حال ایک ہی ہونا چاہیے، عقل یہ باور کرنے سے انکار کرتی ہے کہ جو چیز ایک قوم کے لیے حق ہو، وہ دوسری قوم کے لیے باطل ہو جائے اور جو ایک قوم کے لیے باطل ہو، وہ دوسری قوم کے لیے حق ہو جائے۔

زندگی کی زمانی تقسیم

ان مہملات اور جدید زمانے کے عالمانہ مہملات میں سے ایک اور بات جو حقیقت کے اعتبار سے مہمل ترین ہے، مگر حیرت ہے کہ یقینیت کے پورے وثوق کے ساتھ پیش کی جاتی ہے، انسانی زندگی کی زمانی تقسیم ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو نظامِ زندگی ایک دور میں حق ہوتا ہے، وہ دوسرے دور میں باطل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ زندگی کے مسائل و معاملات ہر دور میں بدل جاتے

ہیں۔ اور نظامِ زندگی کا حق یا باطل ہونا سراسر ان مسائل و معاملات ہی کی نوعیت پر منحصر ہے۔ یہ بات اسی انسانی زندگی کے متعلق کہی جاتی ہے، جس کے متعلق ہی ساتھ ہی ساتھ ارتقاء کی گفتگو بھی کی جاتی ہے، جس کی تاریخ میں کارفرما قوانین بھی تلاش کیے جاتے ہیں، جس کے گزشتہ تجربات سے حال کے لیے سبق اور مستقبل کے لیے احکام بھی مستنبط کیے جاتے ہیں، اور جس کے لیے ''انسانی فطرت'' نامی ایک چیز بھی ثابت کی جاتی ہے۔ میں پوچھتا ہوں، کیا آپ کے پاس کوئی ایسا آلۂ پیمائش ہے، جس سے آپ نوعِ انسانی کی اس مسلسل تاریخی حرکت کے درمیان دور یا زمانے یا عہد کی حد بندیاں کر سکتے ہوں؟ اور کیا یہ ممکن ہے کہ ان حد بندیوں میں سے واقعی کسی ایک خط پر انگلی رکھ کر آپ کہہ سکتے ہوں کہ اس خط کے اس پار جو مسائلِ زندگی تھے وہ اس پار آ کر بالکل تبدیل ہو گئے اور جو حالات اس پار تھے وہ اس پار باقی نہیں رہے؟ اگر فی الواقع انسانی سرگزشت ایسے ہی الگ زمانی ٹکڑوں میں منقسم ہے تب یوں سمجھنا چاہیے کہ ایک ٹکڑا جو گزر چکا ہے وہ بعد والے ٹکڑے کے لیے محض ایک فضول و لایعنی چیز ہو گیا۔ اس کے گزرتے ہی وہ سب کچھ ضائع ہو گیا جو انسان نے اس حصۂ دہر میں کیا تھا۔ اس زمانے میں جو تجربات انسان کو ہوئے، وہ بعد والے زمانے کے لیے کوئی سبق اپنے اندر نہیں رکھتے، کیونکہ وہ حالات و مسائل ہی فنا ہو گئے، جن میں انسان نے بعض طریقوں کا، بعض اصولوں کا، بعض قدروں کے لیے سعی و جہد کا تجربہ کیا تھا۔ پھر یہ ارتقاء کی گفتگو کیوں؟ یہ قوانینِ حیات کی تلاش کس لیے؟ یہ تاریخی استنباط کس بناء پر؟ جب آپ ارتقاء کا نام لیتے ہیں، لامحالہ یہ اس بات کو متضمن ہے کہ وہاں کوئی چیز ضرور ہے، جو تمام تغیرات کا موضوع بنتی ہے اور ان تغیرات کے اندر اپنے آپ کو باقی رکھتے ہوئے پیہم حرکت کرتی ہے۔ جب آپ قوانینِ حیات پر بحث کرتے ہیں، تو یہ اس بات کو مستلزم ہے کہ ان ناپائیدار حالات میں، ان رواں دواں مظاہر میں، ان بننے اور بگڑنے والی صورتوں میں کوئی ناپائیدار اور زندہ حقیقت بھی ہے جو ایک ذاتی فطرت اور کچھ مستقل قوانین بھی رکھتی ہے۔ جب آپ تاریخی استنباط کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تاریخ کے اس طول طویل رستے پر جو مسافر مختلف مرحلوں سے گزرتا ہوا آ رہا ہے اور منزلوں پر منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے، وہ خود اپنی کوئی شخصیت اور اپنا کوئی مستقل مزاج رکھتا ہے۔ جس کے متعلق یہ حکم لگایا جا سکتا ہے کہ وہ مخصوص حالات میں مخصوص طور پر کام کرتا ہے۔ ایک وقت میں بعض چیزوں کو قبول کرتا ہے اور دوسرے

وقت میں انھیں رد کر دیتا ہے اور بعض دوسری چیزوں کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ زندہ حقیقت، یہ پائیدار موضوعِ تغیرات، یہ شاہراہِ تاریخ کا مستقبل مسافر ہی تو ہے، جسے آپ غالباً ''انسانیت'' کہتے ہیں۔ مگر کیا بات ہے کہ جب آپ راستے کی منزلوں اور ان میں پیش آنے والے حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائل پر گفتگو شروع کرتے ہیں، تو اس گفتگو میں ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ خود مسافر آپ کو یاد نہیں رہتا؟ کیا یہ سچ ہے کہ منزلیں اور ان کے حالات اور ان کے مسائل بدل جانے سے مسافر اور اس کی حقیقت بھی بدل جاتی ہے؟ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ ابتدائے آفرینش سے آج تک اس کی ساخت بالکل نہیں بدلی، اس کے عناصر ترکیبی وہی ہیں جواب سے ہزاروں برس پہلے تھے، اس کا مزاج وہی ہے، اس کی فطرت کے تقاضے وہی ہیں، اس کی صفات وخصوصیات وہی ہیں، اس کے رجحانات ومیلانات وہی ہیں، اس کی قوتیں اور صلاحیتیں وہی ہیں، اس کی کمزوریاں اور قابلیتیں وہی ہیں، اس کے فعل وانفعال اور تاثیر وتأثر کے قاعدے وہی ہیں، اس پر کارفرمائی کرنے والی قوتیں وہی ہیں اور اس کا کائناتی ماحول بھی وہی ہے۔ ان میں سے کسی چیز میں بھی ابتدائے آفرینش سے آج تک ذرہ برابر فرق نہیں آیا ہے۔ کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا کہ تاریخ کے دوران میں حالات اور ان سے پیدا ہونے والے مسائلِ زندگی کے تغیر سے خود انسانیت بھی بدلتی چلی آئی ہے، یا وہ بنیادی چیزیں بھی متغیر ہوتی رہی ہیں، جو انسانیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ پھر جب حقیقت یہ ہے تو اس دعوے میں کیا وزن ہو سکتا ہے کہ انسان کے لیے جو چیز کل تریاق تھی، وہ آج زہر ہے، جو چیز کل حق تھی، وہ آج باطل ہے، جو چیز کل قدر رکھتی تھی وہ آج بے قدر ہے؟

انسان کس طرح کے طریقِ زندگی کا حاجت مند ہے

اصل یہ ہے کہ انسانی افراد اور جماعتوں نے تاریخ کے دوران میں نفسِ انسانیت کو اور اس سے تعلق رکھنے والی بنیادی چیزوں کو سمجھنے میں غلطی کھا کر اور بعض حقیقتوں کے اعتراف میں مبالغہ اور بعض کے ادراک میں قصور کر کے جو غلط نظامِ زندگی وقتاً فوقتاً اختیار کیے اور جنہیں انسانیتِ کبریٰ (Humanity of large) نے تجربے کے بعد غلط پا کر دوسرے ایسے ہی نظامات کے لیے جگہ خالی کرنے پر مجبور کر دیا، ان کی سرگزشت کر کے مشاہدے سے یہ نتیجہ اخذ کرلیا گیا ہے کہ انسانیت کے لیے لازماً ہر دور میں ایک نظامِ زندگی درکار ہے۔ جو صرف اسی دور کے حالات و

مسائل سے پیدا ہو، اور ان ہی کو حل کرنے کی کوشش کرے۔ حالانکہ زیادہ صحت کے ساتھ اس سرگزشت سے اگر کوئی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس قسم کے زمانی و دوری نظاماتِ زندگی یا بالفاظِ دیگر موسمی حشرات الارض کو بار بار آزمانے اور ہر ایک کی ناکامی کے بعد اس کے دوسرے جانشیں کا تجربہ کرنے میں، انسانیتِ کبریٰ کا وقت ضائع ہوتا ہے، اس کی راہ ماری جاتی ہے، اس کے نشو و ارتقاء اور اپنے کمالِ مطلوب کی طرف اس کے سفر میں سخت رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ وہ درحقیقت محتاج اور سخت محتاج ہے، ایسے نظامِ زندگی کی جو خود اس کو اور اس سے تعلق رکھنے والی تمام حقیقتوں کو جان کر عالمگیر دائمی اور پائیدار اصولوں پر قائم کیا جائے، جسے لے کر وہ حال و مستقبل کے تمام متغیر حالات سے بخیریت گزر سکے۔ ان سے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کر سکے۔ زندگی کے راستے پر افتاں و خیزاں نہیں، بلکہ رواں اور دواں اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھ سکے۔

کیا انسان ایسا نظام خود بنا سکتا ہے؟

یہ ہے اس ''دین'' یا طریقِ زندگی یا نظامِ زندگی کی نوعیت، جس کا انسان حاجت مند ہے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اگر انسان خدا کی مدد سے بے نیاز ہو کر خود اپنے لیے اس نوعیت کا دین بنانا چاہے، تو کیا وہ اس کوشش میں کامیاب ہو سکتا ہے؟ یہ سوال میں آپ کے سامنے پیش نہ کروں گا کہ آیا انسان اب تک ایسا دین خود بنانے میں کامیاب ہوا ہے۔ کیونکہ اس کا جواب تو قطعاً نفی میں ہے۔ خود وہ لوگ بھی جو آج بڑے بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ اپنے اپنے دین پیش کر رہے ہیں اور ان کے لیے ایک دوسرے سے لڑ مر رہے ہیں۔ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ ان میں سے کسی کا پیش کردہ دین ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے، جن کے لیے انسان، من حیث الانسان ایک ''الدین'' کا محتاج ہے۔ کسی کا دین نسلی و قومی ہے، کسی کا جغرافیائی، کسی کا طبقاتی اور کسی کا دین پیدا ہی اس دور کے تقاضوں سے ہوا ہے، جو ابھی کل ہی گزر چکا ہے۔ رہا وہ دور جو کل آنے والا ہے، اس کے حالات و مسائل کے متعلق کچھ پیشگی نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں بھی وہ کام دے سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ جو دور اب گزر رہا ہے، ابھی تو اسی کے تاریخی تقاضوں کا جائزہ باقی ہے۔ اسی لیے میں یہ سوال نہیں کر رہا ہوں کہ انسان ایسا دین بنانے میں کامیاب ہوا ہے یا نہیں بلکہ یہ کہہ رہا ہوں کہ کامیاب ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ یہ ایک نہایت اہم سوال ہے جس سے سرسری طور پر بحث کرنا مناسب نہیں، یہ انسانی زندگی کے فیصلہ کن سوالات میں سے ایک ہے۔ اس لیے

پہلے خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ وہ چیز کیا ہے، جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اس شخص کی قابلیتیں کیا ہیں، جس کے متعلق یہ پوچھا جارہا ہے کہ وہ اس کو وضع کرسکتا ہے یا نہیں۔

الدّین کی نوعیت

انسان کے لیے جس ''الدین'' کی ضرورت میں نے ابھی ثابت کی ہے اس سے مراد کوئی ایسا تفصیلی ضابطہ نہیں ہے، جس میں ہر زمانے اور ہر قسم کے حالات کے لیے تمام چھوٹے بڑے جزئیات تک مرتب ہوں اور جس کی موجودگی میں انسان کا کام صرف اس کے مطابق عمل کرنا ہو۔ بلکہ دراصل اس سے مراد ایسے ہمہ گیر ازلی وابدی اصول ہیں، جو تمام حالات میں انسان کی رہنمائی کرسکیں، اس کی فکرونظر سعی وجہد اور پیش قدمی کے لیے صحیح رخ متعین کرسکیں اور اسے غلط تجربات میں وقت اور محنت اور قوت ضائع کرنے سے بچاسکیں۔ اس غرض کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ انسان کو اس بات کا علم (قیاس وگمان نہیں بلکہ علم) ہو کہ اس کی اور کائنات کی حقیقت کیا ہے اور کائنات میں اس کی حیثیت کیا ہے۔ پھر وہ اس بات کے جاننے کا (سمجھ بیٹھنے کا نہیں بلکہ جاننے کا) حاجت مند ہے کہ آیا زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے یا پوری زندگی کا ایک ابتدائی حصہ ہے، آیا سفر بس پیدائش سے لے کر موت تک کی مسافت کا ہے، یا یہ پورے سفر میں سے محض ایک مرحلہ ہے۔ پھر اس کے لیے ناگزیر ہے کہ ایک ایسا مقصدِ زندگی اس کے لیے متعین ہو جو حقیقت کے اعتبار سے (نہ کہ محض خواہش کی بنا پر) واقعی حیاتِ انسانی کا مقصود ہو، جس کے لیے دراصل انسان پیدا کیا گیا ہو اور جس کے ساتھ ہر فرد، ہر مجموعۂ افراد اور بحیثیتِ کلی تمام انسانیت کے مقاصد، تمام زمانوں میں، بلا کسی تصادم ومزاحمت کے ہم آہنگ ہوسکیں۔ پھر اس کو اخلاق کے ایسے پختہ اور ہمہ گیر اصولوں کی ضرورت ہے، جو اس کی فطرت کی تمام خصوصیات کے ساتھ مناسبت بھی رکھتے ہوں اور تمام ممکن حالات پر نظری وعملی حیثیت سے منطبق ہوسکتے ہوں۔ تاکہ وہ ان ہی اصولوں کی بنیاد پر اپنی سیرت کی تعمیر کرسکیں، ان ہی کی رہنمائی میں سفرِ زندگی کی ہر منزل اور اس کے حالات میں پیش آمدہ مسائل کو حاصل کرسکیں اور اس خطرے میں مبتلا نہ ہوں کہ تغیر پزیر حالات ومسائل کے ساتھ ساتھ اخلاق کے اصول بناتا اور بدلتا چلا جائے۔ یعنی بالفاظِ دیگر ایک بے اصولا، نرا ابن الوقت *Mere characterless opportunist* بن کر رہ جائے۔ پھر اس کو تمدن کے ایسے جامع اور وسیع اصولوں کی ضرورت ہے، جو انسانی اجتماع

کی حقیقت و غایت اور اس کے فطری تقاضوں کو سمجھ کر بنائے جائیں، جن میں افراط و تفریط اور بے اعتدالی نہ ہو، جن میں تمام انسانوں کی مجموعی مصلحت ملحوظ رکھی گئی ہو اور جن کی پیروی کر کے ہر زمانے میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کی تشکیل، اور ترقی کے لیے سعی کی جا سکے۔ پھر اسے شخصی کردار، اور اجتماعی رویہ اور انفرادی و اجتماعی سعی و عمل کو صحیح سمتِ سفر کا پابند اور بے راہ روی سے محفوظ رکھنے کے لیے ایسے جامع حدود کی ضرورت ہے جو شاہراہِ زندگی پر نشاناتِ راہ کا کام دیں اور ہر موڑ اور ہر دوراہے، ہر خطرناک مرحلے پر اسے آگاہ کر دیں کہ تیرا راستہ ادھر نہیں، بلکہ ادھر ہے۔ پھر اس کو چند ایسے عملی ضابطوں کی ضرورت ہے، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے دائمی اور عالمگیر پیروی کے قابل ہوں اور انسانی زندگی کو اس حقیقت نفس الامری، اس مآلِ زندگی، اس مقصدِ حیات، ان اصولِ اخلاق، ان اصولِ تمدن اور ان حدودِ عمل سے ہمیشہ وابستہ رکھیں، جن کی تعیین اس ''الدّین'' میں کی گئی ہو۔

یہ ہے وہ چیز جسے وضع کرنے کا سوال درپیش ہے۔ اب غور کیجیے کہ کیا انسان ایسے ذرائع رکھتا ہے، جن سے وہ خود اپنے لیے ایک ایسا ''الدّین'' وضع کر سکے؟

انسانی ذرائع کا جائزہ

انسان کے پاس اپنا ''دین'' یا طریقِ زندگی اخذ کرنے کے ذرائع چار سے زیادہ نہیں ہیں۔ پہلا ذریعہ خواہش ہے، دوسرا عقل، تیسرا مشاہدہ و تجربہ ہے اور چوتھا ذریعہ پچھلے تجربات کا تاریخی ریکارڈ۔ غالباً ان کے سوا کسی پانچویں ذریعے کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ ان چاروں ذرائع کا جتنا مکمل جائزہ لے کر آپ دیکھ سکتے ہیں، دیکھیے کہ آیا یہ ''الدین'' کے ایجاد کرنے میں انسان کی مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصہ اس کی تحقیق میں صرف کیا ہے اور بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ ذرائع ''الدّین'' کی ایجاد میں تو مدد نہیں دے سکتے، البتہ اگر کوئی غیر انسانی رہنما ''الدین'' کو پیش کر دے، تو اسے سمجھنے، پرکھنے، پہچاننے اور اس کے مطابق زندگی کے تفصیلی نظام کو وقتاً فوقتاً مرتب کرتے رہنے میں ضرور مددگار بن سکتے ہیں۔

خواہش

پہلے خواہش کو لیجیے۔ کیا یہ انسان کی رہنما بن سکتی ہے؟ اگرچہ یہ انسان کے اندر اصلی محرک عمل ہے مگر اس کی عین فطرت میں جو کمزوریاں موجود ہوں ان کی بناء پر یہ رہنمائی کے قابل

ہرگز نہیں ہو سکتی۔ تنہا رہنمائی کرنا تو درکنار عقل اور علم کو بھی اکثر اس نے گمراہ کیا ہے۔ اس کو تربیت سے خواہ کتنا ہی روشن خیال بنا دیا جائے، بہرحال آخری فیصلہ جب کبھی اس پر چھوڑا جائے گا یہ بلا مبالغہ ۹۹ فی صدی حالات میں غیر مستقیم ہی فیصلہ کرے گی، کیونکہ اس کے اندر جو تقاضے پائے جاتے ہیں، وہ اس کو صحیح فیصلہ کرنے کے بجائے ایسا فیصلہ کرنے پر مجبور کرتے ہیں جس سے مطلوب کسی نہ کسی طرح جلدی اور بآسانی حاصل ہو جائے۔ یہ نفس ''خواہشِ انسانی'' کی طبعی کمزوری ہے۔ لہٰذا خواہ ایک فرد کی خواہش ہو، یا ایک طبقے کی ہو، یا وہ خواہش عام General will ہو جس کا روسو نے ذکر کیا ہے، بہرحال کسی قسم کی انسانی خواہش میں بھی فطرۃً یہ صلاحیت نہیں ہے کہ ایک ''الدین'' کے وضع کرنے میں مددگار بن سکے، بلکہ جہاں تک مسائلِ عالیہ Ultimate problem مثلاً حیاتِ انسانی کی حقیقت، اس کے مآل اور اس کی غایت کا تعلق ہے، اس کو حل کرنے میں تو وہ کسی طرح مددگار بن ہی نہیں سکتی۔

عقل

پھر عقل کو لیجیے۔ اس کی تمام بہترین صلاحیتیں مسلّم، انسانی زندگی میں اس کی اہمیت بھی ناقابلِ انکار اور یہ بھی تسلیم کہ انسان کے اندر یہ بہت بڑی رہنما طاقت ہے۔ لیکن قطعِ نظر اس سوال کے کہ انسان کے لیے ''الدین'' کس کی عقل وضع کرے گی، زید کی؟ بکر کی؟ تمام انسانوں کی؟ یا انسانوں کے کسی خاص گروہ کی؟ اس زمانے کے لوگوں کی؟ یا کسی پچھلے زمانے والوں کی؟ یا آیندہ آنے والوں کی؟ سوال صرف یہ ہے کہ نفس ''عقلِ انسانی'' کے حدود کا جائزہ لینے کے بعد کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''الدّین'' کے وضع کرنے میں اس پر اعتماد کیا جا سکتا ہے؟ اس کے تمام فیصلے منحصر ہیں اس مواد پر، جو حواس اس کو فراہم کر کے دیں۔ وہ غلط مواد فراہم کر کے دیں گے، تو یہ غلط فیصلہ کر دے گی، وہ ناقص مواد فراہم کر کے دیں گے، تو یہ ناقص فیصلہ کر دے گی اور جن امور میں وہ کوئی مواد فراہم کر کے نہ دیں گے، ان میں اگر یہ خود شناس ہے تو کوئی فیصلہ نہ کرے گی، اور اگر برخود غلط ہے تو اندھیرے میں چوپائی تیر چلاتی رہے گی۔ یہ محدودیتیں جس بیچاری عقل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں، وہ آخر کس طرح اس کی اہل ہو سکتی ہے کہ نوعِ انسانی کے لیے ''الدین'' بنانے کی تکلیف اسے دی جائے۔ ''الدّین'' بنانے کا انحصار جن مسائلِ عالیہ کے حل پر ہے، ان میں حواس سرے سے کوئی مواد فراہم ہی نہیں کرتے پھر کیا ان مسائل کا فیصلہ تخیلات،

لاطائل قیاسات اور مجرد اوہام سے کیا جائے گا؟ "الدّین" بنانے کے لیے، جن مستقل اخلاقی قدروں کا تعین ناگزیر ہے۔ ان کے لیے حواس بہت ہی ناقص مواد فراہم کرتے ہیں۔ پھر کیا عقل سے امید کی جاسکتی ہے کہ وہ ناقص مواد پر صحیح و کامل قدریں متعین کرے گی؟ اسی طرح "الدّین" کے جو دوسرے اجزائے ترکیبی میں نے بیان کیے ہیں، ان میں سے کسی ایک جز کے لیے بھی حواس سے بالکل صحیح اور مکمل مواد حاصل نہیں ہوسکتا، جس کی بنا پر عقل ایک جامع اور مکمل نظام بنا سکے اور اس پر مزید یہ ہے کہ عقل کے ساتھ خواہش کا عنصر مستقل طور پر لگا ہوا ہے۔ جو اسے ٹھیٹھ عقلی فیصلے دینے سے روکتا ہے، اور اس کی راست روی کو کچھ نہ کچھ ٹیڑھ کی طرف مائل کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ لہٰذا اگر یہ فرض بھی کرلیا جائے کہ عقلِ انسانی حواس کے فراہم کردہ مواد کی ترتیب اور اس سے استدلال کرنے میں کوئی غلطی نہ کرے گی، تب بھی اپنی کمزوریوں کی بنا پر وہ اتنا بل بوتا نہیں رکھتی کہ اتنے بڑے کام کا بوجھ اس پر ڈالا جاسکے۔ یہ بوجھ اس پر ڈالنا اس پر ظلم بھی کرنا ہے اور خود اپنے اوپر بھی۔

سائنس

اب تیسرے ذریعے کو لیجیے، یعنی وہ علم جو مشاہدات و تجربات سے حاصل ہوتا ہے۔ میں اس علم کی قدر و قیمت کا اعتراف کرنے میں کسی طالب علم سے پیچھے نہیں ہوں۔ نہ ذرہ برابر اس کی تحقیر کرنا پسند کرتا ہوں۔ لیکن اس کی محدودیتوں کو نظر انداز کر کے اسے وہ وسعت دینا جو فی الواقع اسے حاصل نہیں ہے، میرے نزدیک بے علمی ہے۔ "علمِ انسانی" کی حقیقت پر جس شخص کی بھی نظر ہوگی، وہ اس بات کو ماننے سے انکار نہ کرے گا، جہاں تک مسائلِ عالیہ کا تعلق ہے، ان کی کنہہ تک اس کی رسائی محال ہے، کیونکہ انسان کو وہ ذرائع حاصل ہی نہیں ہیں، جن سے وہ اس تک پہنچ سکے۔ نہ وہ اس کا براہِ راست مشاہدہ کرسکتا ہے اور نہ مشاہدہ و تجربہ کے تحت آنے والی اشیاء سے استدلال کر کے اس کے متعلق ایسی رائے قائم کرسکتا ہے، جس پر علم کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ لہٰذا الدّین وضع کرنے کے لیے جن مسائل کا حل معلوم کرنا سب سے پہلی ناگزیر ضرورت ہے، وہ تو علم کی دسترس سے باہر ہی ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اخلاقی قدریں، تمدن کے اصول اور بے راہ روی سے بچانے والی حدود متعین کرنے کا کام، آیا علم کے حوالے کیا جاسکتا ہے یا نہیں، تو اس بحث سے قطع نظر کرتے ہوئے کہ یہ کام کس شخص کا یا کس گروہ یا کس زمانے کا علم انجام دے گا۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ علمی طور پر یہ کام انجام دینے کے لیے ناگزیر شرائط کیا ہیں، اس کے لیے اولین شرط یہ ہے کہ ان تمام قوانینِ فطرت کا علم حاصل ہو جن کے تحت انسان اس دنیا میں جی

رہا ہے۔ اس کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ خود انسان کی اپنی زندگی سے جو علوم تعلق رکھتے ہیں، وہ مکمل ہوں، اس کے لیے تیسری شرط یہ ہے کہ ان دونوں قسم کے علوم یعنی کائناتی اور لسانیات کے علوم کی معلومات یکجا ہوں، اور کوئی ذہنِ کامل اس کو صحیح ترتیب دے کر ان سے صحیح استدلال کر کے انسان کے لیے اخلاقی قدروں، تمدن کے اصولوں اور بے راہ روی سے بچانے والی حدوں کا تعین کرے۔ یہ شرائط نہ اس وقت تک پوری ہوئی ہیں، نہ امید کی جاتی ہے کہ پانچ ہزار برس بعد پوری ہو جائیں گی۔ ممکن ہے کہ انسانیت کی وفات سے ایک دن پہلے یہ پوری ہو جائیں۔ مگر اس وقت اس کا فائدہ ہی کیا ہوگا۔

تاریخ

آخر میں اس ذریعۂ علم کو لیجیے جس سے ہم پہلے انسانی تجربات کا تاریخی ریکارڈ یا انسانیت کا نامۂ اعمال کہتے ہیں۔ اس کی اہمیت اور اس کے فائدوں سے مجھے انکار نہیں ہے۔ مگر میں کہتا ہوں اور غور کریں گے تو آپ بھی مان لیں گے کہ الدّین وضع کرنے کا عظیم الشان کام انجام دینے کے لیے یہ بھی ناکافی ہے۔ میں یہ سوال نہیں کرتا کہ یہ ریکارڈ ماضی سے حال کے لوگوں تک صحت اور جامعیت کے ساتھ پہنچا بھی ہے یا نہیں؟ میں یہ بھی نہیں پوچھتا کہ اس ریکارڈ کی مدد سے الدّین وضع کرنے کے لیے انسانیت کا نمائندہ کس ذہن کو بنایا جائے گا؟ ہیگل کے ذہن کو؟ مارکس کے ذہن کو؟ ارنسٹ ہیکل کے ذہن کو؟ یا کسی اور ذہن کو؟ میں صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ ماضی، حال یا مستقبل میں کس تاریخ تک کا ریکارڈ ایک الدین وضع کرنے کے لیے کافی مواد فراہم کر سکے گا؟ اس تاریخ کے بعد پیدا ہونے والے خوش قسمت ہیں، باقی رہے اس سے پہلے گذر جانے والے، تو ان کا بس اللہ ہی حافظ ہے۔

مایوس کن نتیجہ

یہ مختصر اشارات جو میں نے کیے ہیں، مجھے توقع ہے کہ میں نے ان میں کوئی علمی استدلالی غلطی نہیں کی ہے اور اگر انسان کے ذرائع کا جائزہ، جو میں نے لیا ہے، صحیح ہے تو پھر ہمیں کوئی چیز اس یقین تک پہنچنے سے باز نہیں رکھ سکتی کہ انسان اپنے لیے کوئی کچا پکا، غلط سلط وقتی اور مقامی دین تو وضع کر سکتا ہے، لیکن وہ چاہے کہ الدین وضع کر سکے تو یہ قطعی محال ہے۔ پہلے بھی محال تھا، آج بھی محال ہے اور آئندہ کے لیے بھی اس کے امکان سے پوری مایوسی ہے۔

اب اگر کوئی خدا رہنمائی کے لیے موجود نہیں، جیسا کہ منکرینِ خدا کا خیال ہے، تو انسان کے لیے مناسب یہ ہے کہ خودکشی کرلے۔ جس مسافر کے لیے نہ کوئی رہنما موجود ہو اور نہ جس کے اپنے پاس راستہ معلوم کرنے کے ذرائع موجود ہوں، اس کے لیے یاس اور کامل یاس کے سوا کچھ مقدر نہیں۔ اس کا کوئی ہمدرد اس کے سوا اسے اور کیا مشورہ دے سکتا ہے کہ سرِ راہ ایک پتھر سے اپنی مشکل آسان کرلے اور اگر خدا ہے، لیکن رہنمائی کرنے والا خدا نہیں ہے، جیسا کہ بعض فلسفیانہ اور سائنٹیفک طرز کے مثبتینِ خدا کا گمان ہے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک صورتِ حال ہے۔ جس خدا نے موجوداتِ عالم کی بقا و نشو و نما کے لیے ہر اس چیز کی فراہمی کا انتظام کیا ہے جس کی ضرورت کا تصور کیا جا سکتا ہو، لیکن نہیں ایک کیا تو صرف انسان کی سب سے بڑی ضرورت کا انتظام جس کے بغیر نوع کی زندگی غلط ہوئی جاتی ہے، اس کی بنائی ہوئی دنیا میں رہنا ایک مصیبت ہے، ایسی سخت مصیبت جس سے بڑھ کر کسی دوسری مصیبت کا تصور ممکن نہیں۔ آپ غریبوں اور مفلسوں، بیماروں اور زخمیوں، مظلوموں اور دکھی جنتاؤں کی مصیبت پر کیا روتے ہیں۔ رویئے اس پوری نوع کی مصیبت پر جو اس بے چارگی کے عالم میں چھوڑ دی گئی ہے کہ بار بار غلط تجربے کرکے ناکام ہوتی ہے۔ ٹھوکریں کھا کر گرتی ہے اور پھر اٹھ کر چلتی ہے تاکہ پھر ٹھوکر کھائے۔ ہر ٹھوکر پر ملک کے ملک اور قومیں کی قومیں تباہ ہو جاتی ہیں، اس غریب کو اپنے مقصدِ زندگی تک کی خبر نہیں ہے، کچھ نہیں جانتی کہ کاہے کے لیے سعی و عمل کرے اور کس ڈھنگ پر کرے۔ یہ سب کچھ وہ خدا دیکھ رہا ہے، جو اسے زمین پر وجود میں لایا ہے مگر وہ بس پیدا کرنے سے مطلب رکھتا ہے۔ رہنمائی کی پروا نہیں کرتا۔

امید کی ایک ہی کرن

اس تصویر کے بالکل برعکس قرآن ہمارے سامنے صورتِ حال کا ایک دوسرا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا محض پیدا کردینے والا ہی نہیں ہے، بلکہ رہنمائی کرنے والا بھی ہے۔ اس نے موجوداتِ عالم میں ہر چیز کو وہ ہدایت بخشی ہے، جو اس کی فطرت کے لحاظ سے اس کے لئے ضروری ہے:

اَلَّذِیٓ اَعۡطٰی کُلَّ شَیۡءٍ خَلۡقَهٗ ثُمَّ هَدٰی (طٰہٰ: ۵۰)

(جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا)

اگر اس کا ثبوت چاہو تو جس چیونٹی، جس مکھی، جس مکڑی کو چاہو پکڑ کر دیکھ لو۔ وہی خدا انسان کی بھی رہنمائی کرنے والا ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے صحیح طریقۂ کار یہ ہے کہ خودسری چھوڑ کر اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دے اور جس جامع اور مکمل نظامِ زندگی یا الدّین کی ہدایت اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے بھیجی ہے، اس کی پیروی اختیار کرے۔

دیکھیے ایک طرف تو وہ نتیجہ ہے جو انسان کی قوتوں اور اس کے ذرائع کا جائزہ لینے سے ہم کو حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف قرآن کا یہ دعویٰ ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ یا تو اس دعوے کو قبول کریں یا پھر اپنے آپ کو مایوسی اور اس مایوسی کے حوالے کر دیں جس کے اندھیرے میں برائے نام بھی امید کی کوئی کرن نظر نہیں آتی۔ دراصل صورتِ حال یہ ہے ہی نہیں کہ الدّین حاصل ہونے کے دو وسیلے موجود ہوں اور سوال یہ ہو کہ ہم ان میں سے کس وسیلے سے مدد لیں۔ اصل صورتِ حال یہ ہے کہ الدّین جس وسیلے سے ہم کو مل سکتا ہے، وہ صرف ایک ہے اور انتخاب کا سوال صرف اس امر میں ہے کہ آیا ہم اس تنہا وسیلے سے مدد لیں، یا اس کی دستگیری کا فائدہ اٹھانے کے بجائے تاریکی میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دیں۔

قرآن کے دلائل

یہاں تک جو استدلال میں نے کیا ہے، وہ تو ہم کو محض اس حد تک پہنچاتا ہے کہ ہماری فلاح کے لیے قرآن کے اس دعوے کو قبول کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ یعنی بالفاظِ دیگر کافر نتوانی شد ناچار مسلمان شو۔ لیکن قرآن اپنے دعوے کی تائید میں جو دلائل پیش کرتا ہے، وہ اس سے بہت زیادہ اعلیٰ و اشرف ہیں۔ کیونکہ وہ ہمیں بادلِ ناخواستہ مسلمان ہونے کے بجائے برضا و رغبت مسلمان ہونے پر آمادہ کرتے ہیں۔ اس کی بہت سی دلیلوں میں چار سب سے زیادہ پُرزور ہیں اور ان ہی کو اس نے بار بار بتکرار پیش کیا ہے۔

۱۔ انسان کے لیے اسلام ہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے اس لیے کہ یہی حقیقت نفس الامری کے مطابق ہے اور اس کے سوا ہر دوسرا رویّہ خلافِ حقیقت ہے۔

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ كَرْهًا وَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ (آلِ عمران: ۸۳)

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کوئی اور دین چاہتے ہیں، حالانکہ وہ سب چیزیں جو آسمانوں میں ہیں اور وہ جو زمین میں ہیں چاروناچار اسی کے آگے سرِ تسلیم خم کیے ہوئے ہیں اور اسی کی طرف انھیں پلٹ کر جانا ہے۔

۲۔ انسان کے لیے یہی ایک صحیح طریقِ زندگی ہے، کیونکہ یہی حق ہے اور از روئے انصاف اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہوسکتا۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِى الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ ؕ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ ؕ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ (الاعراف:۵۴)

حقیقت میں تمہارا رب (مالک وفرماں روا) اللہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دوروں میں پیدا کیا اور پھر اپنے تختِ سلطنت پر جلوہ گر ہوا جو دن کو رات کا لباس اڑھاتا ہے اور پھر رات کے تعاقب میں دن تیزی کے ساتھ دوڑتا ہے، سورج اور چاند تارے سب کے سب جس کے تابعِ فرمان ہیں سنو! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا۔ بڑا برکت کرنے والا ہے وہ کائنات کا رب۔

۳۔ انسان کے لیے یہی رویہ صحیح ہے۔ کیونکہ تمام حقیقتوں کا صحیح علم صرف خدا کو ہے اور بے خطا ہدایت صرف وہی کرسکتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَىْءٌ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِى السَّمَآءِ (آلِ عمران:۵)

درحقیقت اللہ سے نہ زمین کی کوئی چیز چھپی ہوئی ہے اور نہ آسمانوں کی۔

يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَىْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ۔ (البقرۃ:۲۵۵)

جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے اور لوگ اس کی معلومات میں سے کسی چیز پر بھی حاوی نہیں ہوسکتے۔ بجز ان چیزوں کے جن کا علم وہ خود ان کو دینا چاہے۔

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (البقرۃ:۱۲۰)

اے پیغمبرؐ کہہ دو کہ اصلی ہدایت صرف خدا ہی کی ہدایت ہے۔

۴۔ انسان کے لیے یہی ایک راہِ راست ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر عدل ممکن نہیں۔ اس کے سوا جس راہ پر بھی انسان چلے گا وہ بالآخر ظلم ہی کی طرف جائے گی۔

وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (البقرۃ:۲۲۹)

جو اللہ کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں وہی ظالم ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ (المائدہ:۴۵)
جو اللہ کی نازل کردہ ہدایت کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہی ظالم ہیں۔

یہ دلائل ہیں جن کی بنا پر ایک معقول انسان کے لیے لازم ہے کہ وہ اللہ کے آگے سرِ تسلیم خم کردے اور ہدایت کے لیے اس کی طرف رجوع کرے۔

خدائی ہدایت کے پرکھنے کا معیار

اب آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک سوال کا جواب دینا ضروری سمجھتا ہوں جو لازماً اس مرحلے پر پہنچ کر ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور اپنی تحقیق کے دوران میں، خود میرے دل میں بھی پیدا ہو چکا ہے۔ وہ سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہر اس شخص کی بات مان لیں جو ایک دن ہمارے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کردے کہ یہ خدا کی طرف سے ہے؟ اگر ایسا نہیں ہے، تو آخر ہمارے پاس وہ کیا معیار ہے، جس سے ہم انسانی ساخت کے دین اور خدائی ہدایت میں فرق کر سکیں؟ اس کا جواب اگرچہ بڑی مفصل تحقیقی بحث چاہتا ہے، مگر میں یہاں مختصر اشاروں میں وہ چار بڑے معیار بیان کروں گا، جو انسانی فکر اور خدائی فکر کو ممیز کرتے ہیں۔

انسانی فکر کی پہلی اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں علم کی غلطی اور محدودیت کا اثر لازماً پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی فکر میں غیر محدود علم اور صحیح علم کی شان بالکل نمایاں ہوتی ہے، جو چیز خدا کی طرف سے ہوگی اس میں آپ ایسی کوئی چیز نہیں پا سکتے جو کبھی کسی زمانے میں کسی ثابت شدہ علمی حقیقت کے خلاف ہو، یا جس کے متعلق یہ ثابت کیا جا سکے کہ اس کے مصنف کی نظر سے حقیقت کا فلاں پہلو اوجھل رہ گیا، مگر اس معیارِ تحقیق کو استعمال کرتے ہوئے یہ بات نہ بھول جائے کہ علم اور علمی قیاس اور نظریۂ علمی میں بڑا فرق ہے۔ ایک وقت میں جو علمی قیاسات اور علمی نظریات دماغوں پر چھائے ہوئے ہوتے ہیں اکثر غلطی سے ان کو "علم" سمجھ لیا جاتا ہے۔ حالانکہ ان کے غلط ہونے کا اتنا ہی امکان ہوتا ہے جتنا ان کے صحیح ہونے کا، اور تاریخِ علم میں ایسے بہت کم قیاسات و نظریات کی نشان دہی کی جا سکتی ہے جو بالآخر "علم" ثابت ہوئے ہیں۔

انسانی فکر کی دوسری بڑی کمزوری نقطۂ نظر کی تنگی ہے۔ اس کے برخلاف خدائی فکر میں وسیع ترین نقطۂ نظر پایا جاتا ہے۔ جب آپ خدائی فکر سے نکلی ہوئی کسی چیز کو دیکھیں گے تو آپ کو ایسا محسوس ہوگا جیسے اس کا مصنف ازل سے ابد تک دیکھ رہا ہے۔ تمام حقیقتوں کو بیک نگاہ دیکھ رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے سے بڑے فلسفی اور مفکر کی فکر بھی ایک بچے کی فکر محسوس ہوگی۔

انسانی فکر کا تیسرا اہم خاصہ یہ ہے کہ اس میں حکمت و دانش، جذبات و خواہشات کے ساتھ کہیں نہ کہیں ساز باز اور مصالحت کرتی نظر آ ہی جاتی ہے۔ بہ خلاف اس کے خدائی فکر میں بے لاگ حکمت اور خالص دانشمندی کی شان اتنی نمایاں ہوتی ہے کہ اس کے احکام میں کہیں آپ جذباتی جھکاؤ کی نشان دہی نہیں کر سکتے۔

انسانی فکر کی ایک اور کمزوری یہ ہے کہ نظامِ زندگی وہ خود تصنیف کرے گا۔ اس میں جانب داری، انسان اور انسان کے درمیان غیر عقلی امتیاز، اور غیر عقلی بنیادوں ہی پر ترجیح بعض علیٰ بعضٍ کا عنصر لازماً پایا جائے گا۔ کیونکہ ہر انسان کی کچھ ذاتی دلچسپیاں ہوتی ہیں، جو بعض انسانوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اور بعض کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتیں۔ بر خلاف اس کے خدائی فکر سے نکلا ہوا نظامِ زندگی ایسے ہر عنصر سے بالکل پاک ہوگا۔ اس معیار پر آپ ہر اس نظامِ زندگی کو جانچ کر دیکھیے جو اپنے آپ کو خدا کی طرف سے الدین کہتا ہو۔ اگر وہ انسانی فکر کی ان تمام خصوصیات سے خالی ہو اور پھر جامعیت اور ہمہ گیری کی شان بھی رکھتا ہو جو اس سے پہلے میں نے الدین کی ضرورت ثابت کرتے ہوئے بیان کی ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اس پر ایمان لانے میں تأمل کریں۔

ایمان کے تقاضے

اب مجھے اپنے خطبے کے بنیادی سوالات میں آخری سوال پر کچھ گفتگو کرنی ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی جب قرآن کے اس دعوے کو تسلیم کر لے اور اس الدّین پر ایمان لے آئے جس کے من جانب اللہ ہونے کا اطمینان اسے حاصل ہو گیا، تو اس تسلیم کرنے اور ایمان لانے کے مقتضیات کیا ہیں۔

میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کے معنی جھک جانے، سپر ڈال دینے، اپنے آپ کو سپرد کر دینے کے ہیں۔ اس جھکاؤ، سپردگی اور سپر اندازی کے ساتھ خود رائی، خود مختاری اور فکر و عمل کی آزادی ہرگز نہیں نبھ سکتی۔ جس دین پر بھی آپ ایمان لائیں۔ آپ کو اپنی پوری شخصیت اس کے حوالے کر دینی ہوگی، اپنی کسی چیز کو بھی آپ اس کی پیروی سے مستثنیٰ نہیں کر سکتے۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ آپ کے دل اور دماغ کا دین ہو۔ آپ کی آنکھ اور کان کا دین ہو، آپ کے ہاتھ اور پاؤں کا دین ہو، آپ کے پیٹ اور دھڑ کا دین ہو، آپ کے قلم اور زبان کا دین ہو، آپ کے اوقات اور آپ کی محنتوں کا دین ہو، آپ کی سعی اور عمل کا دین ہو، آپ کی محبت اور نفرت کا دین ہو، آپ کی دوستی اور دشمنی کا دین ہو، غرض آپ کی شخصیت کا کوئی جز اور کوئی پہلو

بھی اس دین سے خارج نہ ہو۔ جس چیز کو بھی جتنا اور جس حیثیت سے آپ اس دین کے احاطے سے باہر اور اس کی پیروی سے مستثنیٰ رکھیں گے، سمجھ لیجیے کہ اسی قدر آپ کے دعوائے ایمان میں جھوٹ شامل ہے اور ہر راستی پسند انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی کو جھوٹ سے پاک رکھنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کرے۔

پھر یہ بھی میں ابتدا میں عرض کر چکا ہوں کہ انسانی زندگی ایک کُل ہے جسے شعبوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا انسان کی پوری زندگی کا ایک ہی دین ہونا چاہیے۔ دو دو اور تین تین دینوں کی بیک وقت پیروی بجز اس کے کچھ نہیں کہ ایمان کے ڈانواں ڈول اور عقلی فیصلے کے مضطرب ہونے کا ثبوت ہے۔ جب فی الواقع کسی دین کے الدّین ہونے کا اطمینان آپ حاصل کر لیں اور اس پر ایمان لے آئیں تو لازماً اس کو آپ کی زندگی کے تمام شعبوں کا دین ہونا چاہیے۔ اگر وہ شخصی حیثیت سے آپ کا دین ہے، تو کوئی وجہ نہیں کہ وہی آپ کے گھر کا دین بھی نہ ہو، آپ کی تربیتِ اولاد کا، آپ کی تعلیم اور آپ کے مدرسے کا، آپ کے کاروبار اور آپ کی معاش کا، آپ کی مجلسی زندگی اور قومی طرزِ عمل کا، آپ کے تمدن اور سیاست کا، آپ کے ادب اور آرٹ کا دین بھی نہ ہو۔ جس طرح یہ بات محال ہے کہ ایک ایک موتی اپنی جگہ تو موتی ہو، مگر جب تسبیح کے رشتے میں بہت سے موتی منظم ہوں، تو سب مل کر دانۂ نخود بن جائیں۔ اسی طرح یہ بات بھی میرے دماغ کو اپیل نہیں کرتی کہ انفرادی حیثیت سے تو ہم ایک دین کے پیرو ہوں، مگر جب اپنی زندگی کو منظم کریں، تو اس منظم زندگی کا کوئی پہلو اس دین کی پیروی سے مستثنیٰ رہ جائے۔

اِن سب سے بڑھ کر ایمان کا اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ جس دین کے الدّین ہونے پر آپ ایمان لے آئیں، اس کی برکتوں سے ابنائے نوع کو بہرہ ور کرنے کی کوشش کریں اور آپ کی تمام سعی و جدوجہد کا مرکز و محور یہ ہو کہ یہی الدّین تمام دنیا کا دین بن جائے جس طرح حق کی فطرت یہ ہے کہ وہ غالب ہو کر رہنا چاہتا ہے، اسی طرح حق پرستی کی بھی یہ عین فطرت ہے کہ وہ حق کو جان لینے کے بعد باطل پر اسے غالب کرنے کی سعی کیے بغیر چین نہیں لے سکتی۔ جو شخص دیکھ رہا ہو کہ باطل ہر طرف زمین اور اس کے باشندوں پر چھایا ہوا ہے، اور پھر یہ منظر، اس کے اندر کوئی بے کلی، کوئی چبھن، کوئی تڑپ، پیدا نہیں کرتا، اس کے دل میں اگر حق پرستی ہے بھی تو سوئی ہوئی ہے۔ اسے فکر کرنی چاہیئے کہ یہ نیند کا سکوت کہیں موت کے سکوت میں تبدیل نہ ہو جائے۔